

اسلام اور ملکیت زمین

محمد طاسین

اسلام کے معاشی نظام اور اشتراکیت کے معاشی نظام میں ایک بنیادی فرق ہے۔ اسلام بلا تخصیص و بلا استثناء ہر شے کے متعلق انسان کی شخصی و انفرادی ملکیت کو تسلیم کرتا ہے۔ وہ شئی نجی ضرورت اور ذاتی استعمال سے تعلق رکھتی ہو یا ان اشیاء میں سے ہو جن کے ذریعہ دولت پیدا کی جاتی ہے، اس کے برعکس اشتراکیت پہلی قسم کی اشیاء میں تو شخصی و انفرادی ملکیت کی قائل ہے جیسا کہ اشتراکی روس کے دستور میں درج ہے لیکن دوسری قسم کی اشیاء یعنی ذرائع پیداوار اور وسائل آمدنی میں شخصی ملکیت کا قطعی طور پر انکار کرتی ہے۔

شخصی ملکیت سے متعلق اسلام کے نظریے کے مطابق جس طرح کوئی شخص، اشیائے صرف و استعمال کا مالک قرار پاتا ہے جیسے ماکولات و مشروبات کپڑے اور لباس، گھر اور گھریلو سامان، راحت و آسائش اور زیب و زینت کی چیزیں، زر و نقدی وغیرہ، اسی طرح ذرائع پیداوار اور وسائل دولت کا بھی مالک قرار پاتا ہے، جیسے زمین اور کارخانے وغیرہ، یہ دوسری بات ہے کہ مالکالہ تصرف کے لحاظ سے وہ ان دو قسم کی اشیاء میں فرق کرتا ہے، پہلی قسم کی اشیاء میں مالک کو تصرف کی جتنی آزادی دیتا ہے دوسری قسم کی اشیاء میں نہیں دیتا۔

زمین کی شخصی ملکیت کے ثبوت اور جواز میں قرآن و حدیث میں جو مواد ملتا ہے وہ دو طرح کا ہے، ایک وہ جزوی نصوص ہیں جن میں خصوصیت کے ساتھ زمین کی شخصی ملکیت اور اس کے جواز کا بیان ہے، ان میں سے بعض

بالواسطہ طور پر اس کے جواز پر دلالت کرتی ہیں اور بعض بالواسطہ طور پر بالواسطہ کا مطلب یہ کہ ان میں ایسے احکام ہیں جن کی صحت کا دار و مدار زمین کی شخصی ملکیت پر ہے، یعنی اگر زمین کی شخصی ملکیت کا انکار کر دیا جائے تو پھر ان احکام کا کوئی مصرف ہی باقی نہیں رہتا اور یہ احکام سہل قرار پاتے ہیں، اور دوسرا مواد، عام اور مطلق شخصی ملکیت کے بارے میں وہ اصولی اور کلی تصور ہے جو قرآن حکیم کی مختلف آیات سے مجموعی طور پر مستنبط ہوتا ہے۔

پھر چونکہ زمین کی شخصی ملکیت سے متعلق قرآن و حدیث میں جو جزوی نصوص اور تفصیلی احکام ہیں وہ بھی دراصل اس اصولی و کلی تصور پر مبنی ہیں جو مطلق شخصی ملکیت کی بابت قرآن و حدیث میں پایا جاتا ہے لہذا بحث و تحقیق کا صحیح طریقہ یہی ہو سکتا ہے کہ پہلے اس اصولی اور کلی تصور سے بحث کی جائے جو عام شخصی ملکیت سے متعلق ہے اور زمین کی شخصی ملکیت پر اجمالاً دلالت کرتا ہے، اس کے بعد ان جزوی نصوص سے بحث کی جائے جو خاص طور پر زمین کی شخصی ملکیت پر دلالت کرتی ہیں۔

عام اور مطلق شخصی ملکیت کے بارے میں اسلام کا جو اصولی و کلی تصور ہے اسے پوری طرح سمجھنے کے لئے چند امور کا ذہن نشین ہونا ضروری ہے، یا یوں کہئے کہ اس کی تفصیل و توضیح کے سلسلہ میں مندرج ذیل امور کا جاننا ضروری ہے :

اول یہ کہ جہاں تک حقیقی اور دائمی ملکیت کا تعلق ہے وہ ہر شے کے متعلق صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے یعنی صرف اسی کو ہر شے میں ہر قسم کے تصرف اور رد و بدل کا کلی، ذاتی اور دائمی اختیار ہے اور یہ اختیار اس کے لئے مخصوص ہے دوسرا کوئی اس میں اس کا شریک نہیں۔ قرآن حکیم کی جن آیات میں اس کا بیان ہے ان کی تعداد پچاس سے کم نہ ہوگی، مثلاً یہ آیت تقریباً (۲۰) جگہ ہے :

اللہ مافی السموات ومافی الارض . اللہ ہی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ کہ زمین میں ہے،

قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ کی جن صفات کا ذکر ہے ان میں ایک صفت، صفت مالکیت بھی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کائنات کی ہر شے میں ہر قسم کے تصرف کا حقیقی، کامل اور دائمی اختیار ہے اور اس کے کسی تصرف پر کسی کو اعتراض کا حق نہیں، لہذا یہ ایک ایمانی عقیدہ ہے جس کے بغیر کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا، اور جس کا انکار، انسان کو دائرہ اسلام سے خارج کر دیتا ہے، بنا بریں ایک مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ وہ یہ اعتقاد رکھتا ہو کہ ہر شے کا حقیقی و دائمی مالک صرف اللہ تعالیٰ ہے۔

اور دیکھا جائے تو اللہ تعالیٰ کی صفت مالکیت کا اس کی صفت خالقیت اور صفت ربوبیت کے ساتھ گہرا تعلق ہے، قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ کی صفت خالقیت اور صفت ربوبیت کا بار بار اور بہت زور سے ذکر ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ ہی ہر شے کو پیدا کرنے والا اور ہر شے کو بقا اور نشو و نما دینے والا ہے اور دوسرا کوئی اس کے ساتھ ان دو صفتوں میں شریک نہیں، تنہا وہی ہر شے کا خالق اور ہر شے کا رب ہے، اور ظاہر ہے کہ جس نے ہر شے کو پیدا کیا اور جو ہر شے کو بقا اور نشو و نما دے رہا ہو وہی ہر شے کا حقیقی مالک بھی ہو سکتا ہے، مطلب یہ کہ جب یہ مان لیا جائے کہ ہر شے کا خالق اور پروردگار صرف اللہ ہے تو پھر یہ ماننا لازم ہو جاتا ہے کہ اللہ ہی ہر شے کا مالک ہے اور اسی کو ہر شے میں ہر قسم کے تصرف کا حقیقی، کلی اور دائمی اختیار ہے، اس لحاظ سے جس طرح باقی تمام اشیا اللہ کی ملکیت ہیں اسی طرح خود انسان بھی اللہ کی ملکیت ہے، اور کوئی انسان ایک ذرے تک کا مالک نہیں، قرآن مجید میں فرمایا :

لَا يَمْلِكُونَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمَاوَاتِ وَ فِي الْأَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا
وہ آسمانوں اور زمین میں ایک ذرے کے بھی مالک نہیں ہیں

غرضیکہ خالق اور رب ہونے کی وجہ سے ہر شے کا حقیقی ، کامل اور دائمی مالک صرف اللہ تعالیٰ ہے، انسان چونکہ کسی شے کا خالق اور رب نہیں لہذا وہ اس لحاظ سے کسی شے کا مالک بھی نہیں، کیونکہ یہ ایک ناقابل الکار حقیقت ہے کہ انسان ایک ذرہ تک کو نہ پیدا کرسکتا ہے اور نہ فنا کرسکتا ہے۔ ایک انسان عمر بھر جو کرتا یا کرسکتا ہے وہ صرف یہ کہ تحلیل و ترکیب کے عمل سے مادی اشیا کی شکلوں کو ادلتا بدلتا رہتا ہے۔ بنا بریں ایک انسان کے ذریعے عالم موجودات میں اگر کسی نئی شے کا اضافہ ہوتا ہے تو وہ صرف ان تغیرات و تبدلات کا ہوتا ہے جو اس کی سعی و محنت سے وجود میں آکر مادی اشیا کے ساتھ مختلف شکلوں میں قائم ہو جاتے ہیں لہذا ایک انسان اگر کسی شے کا مالک ہو سکتا ہے تو صرف ان اثرات اور تغیرات و تبدلات کا مالک ہو سکتا ہے جو بظاہر اس کی سعی و محنت سے وجود میں آتے اور مختلف شکلوں میں مادی اشیا کے ساتھ قائم ہو جاتے ہیں، بظاہر اس لئے کہا کہ حقیقت میں یہ تغیرات و تبدلات بھی اللہ کے پیدا کرنے سے پیدا ہوتے ہیں کیونکہ وہ بے شمار اسباب و عوامل جن پر انسانی سعی و محنت کا دارومدار ہوتا ہے جیسے ہوا، پانی، روشنی، حرارت، برودت وغیرہ کہ اگر ان میں سے ایک شے بھی موجود نہ ہو تو نہ صرف یہ کہ انسان کوئی سعی و محنت نہیں کرسکتا بلکہ سرے سے زندہ ہی نہیں رہ سکتا، سب اللہ کے پیدا کردہ ہیں، اسی طرح خود انسان اور اس کی وہ دماغی اور جسمانی صلاحیتیں بھی تو اللہ ہی کی پیدا کردہ ہیں جن کے ذریعے وہ سعی و محنت کرتا ہے۔ قرآنی آیت ہے :

واللہ خلقکم و ما تعملون۔ اللہ نے پیدا کیا تم کو اور اس کو جو تم عمل کرتے ہو، یعنی تمہارے اعمال اور ان کے اثرات کو۔ دوسری آیت میں فرمایا ، واللہ خالق کل شئی۔ اللہ ہر شے کا خالق ہے، ظاہر ہے کہ ”ہر شے“ میں انسانی سعی و محنت اور اس کے اثرات و نتائج بھی شامل ہیں لہذا خالق ہونے کی بنا پر انسانی سعی و محنت کے اثرات و نتائج کا بھی حقیقی مالک اللہ

ہے، یہ دوسری بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو اس کی سعی و محنت کے اثرات کا خود اس کو مالک قرار دے دیا ہے لیکن یہ ملکیت ایک انسان کی دوسرے انسانوں کی نسبت ہے اللہ تعالیٰ کی نسبت نہیں۔

اسلامی تصور ملکیت کی توضیح کے سلسلہ میں جس دوسری بات کا جاننا ضروری ہے وہ یہ کہ قرآن حکیم کی متعدد آیات میں اس بات کا واضح بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات ارضی کی تمام اشیا بنی نوع انسان کے تمتع و التفاع کے لئے پیدا فرمائی ہیں، مثال کے طور پر چند آیات ملاحظہ ہوں :

۱۔ هو الذی خلق لکم ما فی الارض جمیعا۔ وہی ہے جس نے تمہارے فائدہ کے لئے زمین کی سب چیزوں کو پیدا کیا۔

۲۔ ولکم فی الارض مستقر و متاع الی حین۔ اور تمہارے لئے زمین میں ٹھہرا اور فائدہ اٹھانا ہے ایک وقت تک

۳۔ والارض وضعها للانام۔ اور زمین کو خاص وضع سے بنایا

یا رکھا لوگوں کے فائدہ کے لئے

۴۔ ولقد مکنا کم فی الارض وجعلنا لکم فیها معاش۔ اور بلاشبہ ہم نے متمکن کیا یا مکین بنایا تم کو زمین میں اور بنایا

اور مہیا کیا اس میں تمہارے التفاع کے لئے سامان معاش،

۵۔ والارض بعد ذالک دحھا، اخرج منها ماء و مرعھا، والجبال ارسھا، متاعا لکم و لالعامکم۔ اور اس کے بعد زمین کو ہموار کر کے بچھایا، اس میں سے پانی نکالا اور چارا اکایا، اور پہاڑوں کو مضبوطی کے ساتھ جمایا تمہارے فائدہ کے لئے اور تمہارے

سویشیوں کے فائدہ کے لئے۔

۶۔ انا صبیئنا الماء حباء، ثم شققنا الارض شقاء،
فالبینا فیہا حباء، وعینا وقضبا و زیتونا و
نخلًا، وحدائق غلباء، وفاکھة وایاء، متاعا
لکم، ولالعاسکم۔
بے شک ہم نے خوب پانی برسایا
پھر زمین کو پھاڑا، پھر اس میں
سے اکابا، غلہ، انگور، ترکاریاں،
زیتون، کھجور اور کھنے باغ اور
پھل، اور چارا تمہارے فائدہ کے
لئے اور تمہارے جانوروں اور
سوشیوں کے فائدہ کے لئے۔

۷۔ هو الذی جعل لکم الارض ذلولا فاسخوا
فی مناکیبها وکلوا من رزقه۔
اللہ وہی ہے جس نے کیا
تمہارے فائدہ کے لئے زمین کو
پائمال، پس چلو تم اس کے
راستوں میں اور کھاؤ اس کے
رزق سے۔

قرآن حکیم کی مذکورہ بالا آیات کے سیاق و سباق سے ظاہر ہوتا ہے کہ
ان میں جو خطاب ہے وہ کسی خاص زمان و مکان سے تعلق رکھنے والے خاص لسل
و رنگ کے انسانوں سے مختص نہیں بلکہ بلا کسی تخصیص و امتیاز کے اور
بغیر کسی تفریق و استثناء کے نوع انسان کے تمام افراد اس کے مخاطب ہیں
خواہ وہ کسی زمانے میں اور کرۂ ارض کے کسی حصہ پر ظاہر ہوں، لہذا
مطلب یہ ہوا کہ زمین میں جو مظاہر فطرت اور جو جمادات، نباتات اور حیوانات
ہیں یہ سب بنی نوع انسان کے انتفاع و استفادہ کے لئے ہیں گویا یہ بنی نوع
انسان کے لیے قدرت کا عام عطیہ ہیں جن سے فائدہ اٹھانے کا ہر انسان کو پکسان
حق ہے اور اس حق استفادہ میں کسی کو کسی پر کوئی ترجیح اور برتری
نہیں بلکہ بحیثیت انسان کے تمام انسان اس میں برابر کے شریک ہیں، اس
لئے کہ ہر انسان اپنی طبعی عمر تک اطمینان کے ساتھ زندہ رہنے اور اپنے

مراحل ارتقا' حسن و خوبی کے ساتھ طے کرنے کے لئے رزق و مال کا محتاج ہے لہذا رب العلمین اور رب الناس نے اپنے پیہہ کردہ وسائل رزق و مال سے ہر انسان کو رزق و مال حاصل کرنے اور فائدہ اٹھانے کا مساوی حق دیا ہے، یعنی جس ضرورت اور احتیاج کی بنا پر یہ حق ہے وہ تمام انسانوں میں یکساں اور برابر ہے لہذا یہ حق بھی سب کے لئے یکساں و برابر ہے ۔

قرآن حکیم میں ایسی متعدد آیات ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ نے انسان کو خلافت ارضی سے نوازا اور اس کو زمین میں اپنا نائب بنایا ہے، مطلب یہ کہ انسان کو ان جملہ دماغی و جسمانی صلاحیتوں اور ان تمام فکری و عملی قوتوں سے آراستہ کر کے پیدا کیا گیا ہے جن کے ذریعے وہ دنیا کی تمام اشیا' اور زمین کی جملہ انواع مخلوقات میں تصرف کرسکتا اور ان کو مطیع و مسخر کر کے ان سے پورا پورا فائدہ اٹھا سکتا ہے، کائنات میں انسان کی یہ جو ہوزیشن ہے اپنے ثبوت کے لئے کسی دلیل کی محتاج نہیں بلکہ یہ ایک حقیقت ہے جس کا ہر آن مشاہدہ کیا جا سکتا ہے، اس میں سمجھنے کی بات یہ ہے کہ اس حقیقت کو اللہ نے خلافت سے کیوں تعبیر فرمایا ، خلافت سے تعبیر کرنے کا مطلب، دراصل انسان کو اس امر پر متنبہ کرنا ہے کہ اس کو تسخیر و تصرف کی جو ذہنی اور عملی صلاحیتیں عطا کی گئی ہیں وہ اصلاح و تعمیر کے لئے ہیں افساد اور تخریب کے لئے نہیں، یعنی اللہ کا منشا' یہ ہے کہ انسان اپنی ان صلاحیتوں اور قوتوں کو اصلاح و تعمیر میں صرف کرے بگاڑ اور تخریب میں صرف نہ کرے، کیونکہ اللہ جو حقیقی بادشاہ ہے اور جس نے انسان کو زمین میں اپنا خلیفہ بنایا اور اس کو تسخیر و تصرف کی صلاحیتوں سے نوازا، تخریب و افساد کو پسند نہیں کرتا بلکہ تعمیر و اصلاح کو پسند کرتا ہے لہذا بحیثیت خلیفہ کے انسان پر یہ لازم ہے کہ وہ اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کو تخریب و افساد میں نہیں بلکہ صرف تعمیر و اصلاح میں صرف کرے، بالفاظ دیگر انسان کو یہ باور کراے کہ وہ زمین میں اللہ کا خلیفہ ہے دراصل یہ کہا گیا ہے کہ

مظاہر لطرت اور اشیائے کائنات میں اس کا ہر وہ تصرف جائز اور درست ہے جس سے تعمیر و اصلاح ہو سکتی ہو اور خود انسان کو فائدہ پہنچ سکتا ہو اور ہر وہ تصرف ناجائز اور غلط ہے جس کا نتیجہ تباہی و بربادی کی صورت میں نکلتا ہو اور جس سے خود انسان کو نقصان پہنچ سکتا ہو، پھر چونکہ کائنات ارضی کی یہ خلافت آدم اور اولاد آدم یا یوں کہئے کہ بنی نوع انسان کے لئے ہے لہذا نوع انسان کے ہر ہر فرد کو اشیائے ارضی میں تصرف کرنے اور ان سے فائدہ اٹھانے کا مساوی حق ہے اور اس میں کسی کو کسی پر کوئی ترجیح اور فوقیت نہیں۔

گویا اللہ تعالیٰ نے جو ہر شے کا خالق، رب اور حقیقی مالک ہے اپنی پیدا کردہ مخلوق کو اشیاء سے فائدہ اٹھانے اور فائدے کی خاطر ان میں تصرف کرنے کا بنی نوع انسان کو حق اور اختیار دیا ہے، اور یہ حق و اختیار چونکہ انسانیت کی بنا پر ہے لہذا ہر انسان اس میں برابر کا شریک ہے۔

تیسری بات جس کا اسلامی تصور ملکیت کے سلسلہ میں جاننا ضروری ہے وہ یہ کہ قرآن و حدیث کی بعض دوسری نصوص سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حق استفادہ اور حق تصرف میں جس مساوات و برابری کا اوپر ذکر ہوا ہے یہ سب انسانوں کے درمیان اس وقت تک ہے جب تک وہ اشیاء اور وسائل رزق و مال اپنی قدرتی ہیئت و شکل پر برقرار ہوں اور کسی انسان کے تصرف سے ان میں مفید تغیر و تبدل رونما نہ ہوا ہو، کیونکہ ان دوسری نصوص میں یہ بیان ہے کہ جو قدرتی شے سب سے پہلے کسی انسان کے قبضہ و تصرف میں آتی ہے، یا جو انسان سب سے پہلے کسی قدرتی شے میں تصرف کر کے اس کی ہیئت و شکل کو بدل کر اس میں کچھ مزید افادیت پیدا کر دیتا ہے وہ شے اب اس خاص انسان کے استفادہ کے لئے مخصوص ہو جاتی ہے اور اس کو اس سے فائدہ اٹھانے کے حق میں دوسروں پر ترجیح و تخصیص حاصل ہو جاتی ہے، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :

من سبق الى ما لم يسبق اليه احد فہو لہ۔ جس نے سبقت کی اس نے کی طرف جس کی طرف کسی نے سبقت نہ کی تھی پس وہ اس کے لئے ہے، اس حدیث نبوی میں جو اجمال ہے اس کی تفصیل دوسری احادیث میں ملتی ہے وہ تفصیل یہ کہ بعض اشیا کے متعلق حق استفادہ میں یہ ترجیح و تخصیص محض قبضے اور استیلا سے حاصل ہو جاتی ہے اور بعض کے متعلق محض قبضہ و استیلا سے نہیں بلکہ جب انسان اس کو اپنی سعی و محنت سے زیادہ مفید و کارآمد بنا دیتا ہے اور اس کی قدرتی افادیت میں ایک نئی افادیت پیدا کر دیتا ہے، ذیل میں کچھ مثالیں ملاحظہ فرمائیے :

پہلی مثال دریا کے پانی کی لیجئے جب تک وہ دریا میں اپنی قدرتی حالت و شکل پر برقرار رہتا ہے اس کا ایک ایک قطرہ تمام بنی نوع انسان کے استفادہ کے لئے ”سباح العام“ ہوتا ہے اور اس سے فائدہ اٹھانے کے حق میں کسی انسان کو دوسرے پر کوئی ترجیح و تخصیص نہیں ہوتی، لیکن جوں ہی کوئی شخص دوسروں سے سبقت کر کے دریا سے کچھ پانی اپنے چلو وغیرہ میں اٹھا لیتا ہے تو اب یہ اٹھایا ہوا پانی اس اٹھانے والے شخص کے انتفاع و استفادے کے لئے مخصوص ہو جاتا ہے یعنی اس پانی سے فائدہ اٹھانے کے حق میں اس شخص کو دوسروں پر ترجیح و تخصیص حاصل ہو جاتی ہے اور اب دوسرا کوئی شخص اس کی رضا مندی اور اجازت کے بغیر اس پانی میں نہ تصرف کر سکتا ہے اور نہ اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

دوسری مثال جنگلی جانوروں، پرندوں اور پھلوں وغیرہ کی ہے جب تک وہ جنگل میں اپنی قدرتی حالت پر پالی اور برقرار رہتے ہیں سب انسانوں کے استفادہ کے لئے عام اور مباح ہوتے ہیں اور ان سے استفادہ کرنے کا حق نوع انسان کے تمام افراد کو یکساں طور پر حاصل ہوتا ہے لیکن جب ایک شخص دوسروں سے پہل کر کے جنگل جاتا اور وہاں سے کوئی جانور یا پرندہ پکڑ کر یا پھل وغیرہ

توڑ کر آبادی میں لے آتا ہے۔ تو اس جالور، پرلنسے اور پھل سے فائدہ اٹھانے کے حق میں اس شخص کو دوسرے سالوں پر ترجیح و تخصیص حاصل ہو جاتی ہے اور اب دوسرے کسی کے لئے یہ جایز نہیں رہتا۔ کہ وہ اس شخص کی رضامندی یا اجازت کے بغیر اس سے فائدہ اٹھا سکے، خود اس شخص کو اس میں ہر اس تصرف کا اختیار ہوتا ہے جو استفادے کے لئے ضروری ہو مثلاً اس کو ذاتی استعمال میں لاسکتا ہے، اس کو کمائی کا ذریعہ بنا سکتا ہے نیز کسی دوسرے کو بلا معاوضہ یا بالمعاوضہ دے سکتا ہے وغیرہ وغیرہ، لیکن دوسرے کسی کو اس میں ان تصرفات کا اختیار نہیں ہوتا الا یہ کہ وہ شخص اس کو اجازت دے دے۔

تیسری مثال ایک خطہ زمین کی لیجئے، جب تک وہ اپنی قدرتی حالت پر بنجر و غیر آباد پڑا رہتا ہے سب کے استفادے کے لئے مباح اور عام ہوتا ہے اور اس سے فائدہ اٹھانے اور اس میں جائز تصرف کرنے کے حق میں کسی کو کسی پر کوئی ترجیح و تخصیص نہیں ہوتی بلکہ سب انسان اس حق میں برابر ہوتے ہیں، لیکن جب کوئی شخص دوسروں سے سبقت کر کے خطہ زمین پر قبضہ کر لیتا ہے اور اپنی محنت و مشقت سے اس کو آباد کر کے قابل کاشت بنا دیتا ہے تو اس سے استفادے کے حق میں اس شخص کو دوسروں پر ترجیح و تخصیص حاصل ہو جاتی ہے اور اس کو اس خطہ زمین میں ہر اس تصرف کا ترجیحی اختیار حاصل ہو جاتا ہے جس سے اس کو فائدہ پہنچتا ہو اور دوسروں کو نقصان نہ پہنچتا ہو، اور اب دوسرا کوئی اس کی اجازت کے بغیر، استفادے کی غرض سے اس میں تصرف نہیں کر سکتا، چنانچہ زمین کے متعلق بطور خاص رسول اللہ صلیم کا ارشاد ہے :

من احيا ارضا ميتة فهي له۔ جس نے زندہ کیا کسی مردہ زمین کو یعنی غیر آباد کو آباد کیا، وہ اس کے لئے ہے، اور ایک دوسری حدیث کے الفاظ ہیں :

لہو احق بہا۔ پس وہ اس خطہ زمین کا زیادہ حق دار ہے، پہلی حدیث کے لفظ لہ سے تخصیص اور دوسری حدیث کے لفظ "احق"، سے ترجیح کا مفہوم پیدا ہوتا ہے لہذا مطلب یہ ہوا کہ جو شخص کسی بنجر و غیر آباد زمین کو اپنی محنت و مشقت سے آباد کرتا اور قابل کاشت بناتا ہے اس کو اس خطہ زمین سے استفادے کے حق میں دوسروں پر ترجیح و تخصیص حاصل ہو جاتی ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو دراصل کسی شے سے التفاع و استفادے کے تخصیصی اور ترجیحی حق ہی کا دوسرا نام حق ملکیت ہے اور جس شخص کو کسی شے کے متعلق یہ حق حاصل ہوتا ہے وہ اس شے کا مالک کہلاتا ہے۔

فقہائے اسلام اور علمائے قانون نے ملکیت اور حق ملکیت کی جتنی تعریفیں تجویز کی ہیں ان کا بغور جائزہ لیا جائے تو حاصل یہ نکلتا ہے کہ ملکیت اس خصوصی تعلق کا نام ہے جو کسی انسان اور کسی شے کے مابین خاص اسباب کے تحت قائم ہوتا ہے اور جس کی وجہ سے اس انسان کو اس شے میں تصرف کرنے اور اس سے فائدہ اٹھانے کا خصوصی اختیار حاصل ہوتا ہے۔ وہ اس کو اپنے ذاتی استعمال میں لاسکتا ہے، مزید آمدنی اور کمائی کا ذریعہ بنا سکتا ہے، معاوضہ کے ساتھ یا بغیر معاوضہ کے دوسروں کو دے سکتا ہے، اور اس شخص کا اس شے سے یہ خصوصی تعلق، دوسروں کے لئے اس شے سے استفادے کی راہ میں رکاوٹ بنتا ہے، یعنی دوسروں کے لئے شرعاً اور قانوناً یہ جائز نہیں ہوتا کہ وہ اس شخص کی اجازت کے بغیر اس شے میں تصرف یا اس سے استفادہ کریں، ملکیت کی ان تعریفوں میں سے چند تعریفیں درج ذیل ہیں :

۱۔ الملك هو اختصاص حازر شرعاً ملکیت، انسان اور شے کے درمیان
یسوغ التصرف الا لمالع۔ (العاوی وہ خصوصی تعلق ہے جو شرعاً
دوسروں کے لئے اس شے سے استفادہ
للمتسلی)

میں رکاوٹ اور اس انسان کے
تصرف کے لئے وجہ جواز بنتا ہے

الا یہ کہ کوئی مائع موجود ہو،
جیسے جنون وغیرہ،

ملکیت کسی شے میں تصرف پر وہ
قدرت ہے جو کسی انسان کے لئے
شارع کے ثابت کرنے سے ابتدائی
طور پر ثابت ہوتی ہے مگر یہ کہ
کوئی مائع موجود ہو،

۲۔ الملك قدرة يثبتها الشارع ابتداءً على
التصرف الا لمائع - (الاشباه و النظائر
لابن نجيم)

ملکیت، انسان اور کسی شے کے درمیان
اس شرعی تعلق کا نام ہے جو اس
انسان کے لئے اس شے میں تصرف
کا موجب اور اس کے غیر کے لئے
اس میں تصرف کا مانع بنتا ہے،

۳۔ الملك اتصال شرعى بين الانسان و
بين شىء يكون سببا لتصرفه و مانعا
عن تصرف غيره (دستور العلماء)۔

ملکیت کا مطلب ہے انسان کو شرعاً
قدرت حاصل ہونا بذات خود یا
بذریعہ نائب خود، کسی مادی یا
معنوی شے سے نفع اٹھانے کی اور
ان کے بدلے دوسروں سے معاوضہ
لینے کی،

۴۔ الملك تمكن الانسان شرعاً بنفسه او
بنائبه من الالتفاح بالعین او بالمنفعة
ومن اخذ العوض عنهما، (الفروق
للقرافی)۔

کسی شے کے حق ملکیت کا مطلب
وہ حق ترجیح ہے جو کسی انسان
کو اس شے کے استعمال کرنے، ذریعہ
کمائی بنانے اور اس میں تصرف
کرنے کے متعلق حاصل ہوتا ہے،

۵۔ حق ملكية الشىء هو حق الاستئثار
باستعماله و باستغلاله و بالتصرف
فيه،

ان تعریفوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملکیت ایک معنوی حقیقت ہے جس کا وجود خارج میں نہیں بلکہ ذہن میں ہوتا ہے، خارج میں اس کے کچھ آثار ہوتے ہیں لہذا اس معنوی حقیقت کو سمجھنے سمجھانے میں ان جانے پہچانے آثار سے مدد لی جاتی ہے، مثلاً اس شے کا کسی خاص انسان کے استفادہ کے لئے مخصوص ہونا، اس انسان کو اس میں تصرف کا اختیار ہونا، دوسروں کے لئے اس میں تصرف کا ناجائز اور ممنوع ہونا، اور پھر چونکہ اس حقیقت کو مختلف الفاظ سے بیان کیا جاسکتا ہے لہذا تعریفوں میں لفظی اختلاف کا ظاہر ہونا ایک قدرتی امر ہے۔

بہر حال اسلام کا یہ محکم اصول ہے کہ جو شخص سب سے پہلے کسی قدرتی شے پر قبضہ کرتا ہے اور اس کو اپنی سعی و محنت سے زیادہ مفید اور کارآمد بنا دیتا ہے اس کو اس شے سے استفادے اور اس میں تصرف کے حق میں دوسروں پر ترجیح حاصل ہو جاتی ہے اور وہ اس کا مالک بن جاتا ہے۔

اور اس اصول کی بنیاد دراصل اس فطری تصور پر ہے کہ ہر انسان اپنی سعی و محنت کے اثرات و ثمرات کا خود مالک ہے اور ان سے فائدہ اٹھانے کا صرف اسی کو حق ہے، قرآن حکیم کی متعدد آیات میں اس فطری تصور کا بیان ہے ارشاد الہی ہے: لیس للانسان الا ما سعی، نہیں ہے انسان کے لئے مگر وہ جو اس کی سعی سے وجود میں آیا، بالفاظ دیگر انسان کسی چیز کا مالک نہیں سوائے اپنی سعی و محنت کے اثرات کے، اسی طرح اس آیت کریمہ کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ انسان اپنی سعی و محنت کے اثرات و ثمرات کا خود مالک اور حقدار ہے۔ ایک دوسری آیت میں ارشاد ہے: لہا ما کسبت و علیہا ما اکتسبت۔ اسی کے لئے ہے اس کے اچھے عمل کا فائدہ اور اسی پر ہے اس کے برے فعل کا ضرر، بطلب یہ کہ ہر متنفس اور ہر انسان اپنے کسب و اکتساب کے اچھے برے نتائج و اثرات کا خود حق دار اور ذمہ دار ہے۔ یہاں یہ معلوم رہے

کہ قرآن مجید کی مذکورہ آیات کا مفہوم و مطلب نہایت وسیع اور جامع ہے، انسان کی دلیوی اور اخروی دونوں زندگیوں پر حاوی اور دونوں کے امور و معاملات سے یکساں تعلق رکھتا ہے، لہذا اس کو صرف اخروی زندگی یا صرف دلیوی زندگی تک محدود کر دینا صحیح نہیں کیونکہ قرآنی تعلیمات کا تعلق انسان کی موجودہ اور آئندہ دونوں زندگیوں سے ہے اور وہ دونوں کی صلاح و فلاح چاہتا ہے، لہذا مذکورہ قرآنی آیات کا مطلب یہ ہوا کہ انسان کے اچھے عمل پر جو اچھے اور مفید اثرات دلیا میں مرتب ہوتے ہیں یا آخرت میں مرتب ہوں گے وہ سب اس کے فائدہ کے لئے مخصوص ہیں، اسی طرح اس کے برے اعمال پر جو بڑے اور مضر اثرات دلیا میں ظاہر ہوتے ہیں یا آخرت میں ظاہر ہوں گے ان کے ضرر کا حق دار اور ذمہ دار بھی وہ خود ہے۔

یہ اصولی تصور جو ان آیات میں بیان کیا گیا ہے اپنے مضمرات و متضمنات اور اپنے لوازم و مقتضیات کے لحاظ سے نہایت اہم تصور ہے، اس کے ساتھ انسان کی انفرادی و اجتماعی اور مادی و روحانی فلاح و بہبود کا گہرا تعلق ہے اور اس پر ایک صالح معاشرے اور خوشگوار تمدن کا بڑی حد تک دار و مدار ہے، اس کو نظر انداز کر دیا جائے تو پھر عدل و ظلم اور جزا و سزا کا کوئی مطلب ہی باقی نہیں رہتا، یہ تصور درحقیقت انسان کے ایک بنیادی اور فطری حق کا محافظ ہے جس کے تحفظ کے بغیر کبھی بھی دنیا میں پائدار امن قائم نہیں ہو سکتا۔

اس اصولی تصور کے عملی مقتضیات میں سے ایک مقتضی یہ ہے کہ جس انسان کے اختیاری فعل و عمل سے جو مفید اثرات اور جو بہتر فوائد و ثمرات وجود میں آئیں وہ اس کی ذات کے لئے مخصوص اور اس کے حق میں محفوظ ہوں لہذا یہ تصور انسانی فطرت کے عین مطابق ہے اس لئے کہ یہ واقعہ ہے کہ انسان اپنے فہم و شعور اور اختیار و اوداعے سے کوئی کام صرف اس وقت کرتا ہے جب اس کو یہ یقین یا غالب ظن ہوتا ہے کہ اس کام کے اثرات و نتائج سے اس کو

کوئی مادی یا روحانی فائدہ پہنچے گا، بلکہ 'کپہری نگاہ' سے دیکھا جائے تو ذاتی فائدہ کا شعور ہی وہ اصل محرک ہوتا ہے جو انسان کو کسی اختیاری و ارادی فعل پر آمادہ کرتا ہے اور جس کی تحریک سے انسان نہایت مشکل اور دشوار کاموں کو بغوشی انجام دے دیتا ہے، یہ دوسری بات ہے کہ بعض دفعہ وہ فہم و شعور غلط ثابت ہوتا اور انسان کو لداست الٹھانی پڑتی ہے، لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ انسان کے ہر اختیاری و ارادی فعل کی تہ میں ذاتی فائدے کا شعور ضرور کار فرما ہوتا ہے اور وہ جو کچھ کرتا ہے اپنے ہی فائدے کے لئے کرتا ہے۔ اور بظاہر جب وہ دوسروں کے لئے ایثار و قربانی کرتا ہے اور تکلیفیں و مشقتیں اٹھاتا ہے تو درحقیقت اس کا محرک بھی ذاتی فائدے کا شعور ہوتا ہے، وہ سمجھتا ہے کہ اس سے اس کو دنیا میں عزت و جاہ اور شہرت و ناموری حاصل ہوگی اور آخرت میں اللہ کی خوشنودی اور جنت کی زندگی نصیب ہوگی، غرضیکہ یہ انسان کی ناقابل تغیر فطرت ہے کہ وہ اپنے اختیار و ارادے اور اپنی مرضی خوشی سے جو بھی کام کرتا ہے محض اپنے فائدے کے لئے کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس کام کا فائدہ اس کے لئے مخصوص ہو اور دوسرا کوئی اس کی اجازت کے بغیر اس کو استعمال نہ کرے۔

اسی طرح یہ اصولی تصور، عقل و دانش اور عدل و انصاف کے بھی عیر مطابق ہے، وہ یوں کہ ایک انسان جب کوئی کام کرتا ہے عام اس سے کہ دماغی ہو یا جسمانی تو اس میں اس کی الرجی اور توانائی خرچ ہوتی اور اس میں زحمت و تکلیف اٹھاتا ہے لہذا عقل اور انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ انسان کی سعی و محنت کا فائدہ صرف اسی کے لئے مخصوص ہو اور دوسرا کوئی اس کی رضا مندی کے بغیر اس سے استفادہ نہ کرے۔

چنانچہ عملی اطلاق و تطبیق کے لحاظ سے اس اصولی تصور کی جو مختا شکلی ہو سکتی ہیں ان میں سے ایک شکل یہ ہے کہ جس مادی شے کے ۔

کسی انسان کی سعی و محنت کے مفید اثرات وابستہ اور قائم ہو جائیں وہ شے اس انسان کے انتفاع و استفادے کے لئے مخصوص ہو اور اس سے فائدہ اٹھانے کے حق میں اس انسان کو دوسروں پر ترجیح حاصل ہو کیونکہ اس کے بغیر اس کی سعی و محنت کے اثرات اس کے حق میں محفوظ اور اس کے فائدہ کے لئے مخصوص نہیں ہو سکتے، زیادہ واضح الفاظ میں مطلب یہ ہے کہ جب ایک انسان کسی قدرتی شے کو اپنے قبضہ و تصرف میں لیتا ہے تو اس میں اس کو محنت و مشقت اٹھانی پڑتی ہے، اس محنت و مشقت کا اثر اس تغیر و تبدل کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے جو شے کی قدرتی ہیئت و شکل میں وقوع پذیر ہوتا ہے، مثلاً جب کوئی شخص دریا سے اپنے چلو یا کسی برتن میں پانی اٹھا لیتا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کو اس میں محنت کرنی پڑتی ہے، اور اس سے اس پانی کی قدرتی ہیئت و شکل میں جو تغیر واقع ہوتا ہے وہ اس محنت کا ایک محسوس اثر ہوتا ہے، اس اثر کو اس محنت کا فائدہ بھی کہہ سکتے ہیں، ظاہر ہے کہ یہ اس شخص کے حق میں صرف اسی وقت محفوظ اور اس کے استفادہ کے لئے صرف اسی صورت میں مخصوص ہو سکتا ہے جب کہ وہ پانی اس کے استفادہ اور تصرف کے لئے مخصوص ہو جس کے ساتھ وہ اثر قائم ہے، علیٰ هذا القیاس جب کوئی شخص کسی غیر آباد خطہ زمین کو آباد کرتا ہے تو اس میں اس کو محنت و مشقت اٹھانی پڑتی ہے اور اس محنت و مشقت کے اثرات، اس خطہ زمین کے ساتھ آبادی کی شکل میں قائم ہو جاتے ہیں، اب یہ اثرات اس شخص کے فائدہ کے لئے صرف اس وقت مخصوص ہو سکتے ہیں جب وہ خطہ زمین اس کے استفادہ کے لئے مخصوص ہو جس کے ساتھ وہ اثرات قائم اور وابستہ ہیں، لہذا اسلام نے یہ اصول مقرر کیا ہے کہ جو قدرتی شے سب سے پہلے کسی شخص کے قبضہ اور تصرف میں آجائے حق استفادہ اور حق تصرف میں اس شخص کو دوسروں پر تخصیص و ترجیح حاصل ہو جاتی ہے اور وہ شخص اس شے کا مالک بن جاتا ہے۔

اور پھر چونکہ حق استفادہ اور حق تصرف میں یہ تخصیص و ترجیح،

، اثرات کی بنا پر وجود میں آتی ہے جو کسی شخص کی سعی و محنت سے کسی کے ساتھ قائم ہو جاتے ہیں لہذا جب تک وہ اثرات قائم رہتے ہیں یہ ترجیح تخصیص بھی قائم رہتی ہے جس کا دوسرا نام ملکیت ہے، اور جب وہ اثرات ٹل ہو جاتے ہیں تو یہ ترجیح و تخصیص اور یہ ملکیت بھی زائل ہو جاتی ہے، کیونکہ علت کے انتفا سے معلول کا انتفا لازمی ہوتا ہے، مثلاً جب وہ شخص ریا سے اٹھائے ہوئے ہائی کو دوبارہ دریا میں ڈال دیتا ہے یا جنگل سے پکڑ کر آئے ہوئے شکار کو بھر جنگل میں چھوڑ دیتا ہے تو اس سے اس کی محنت و مشقت کے اثرات زائل ہو جاتے اور وہ ہائی اور جانور اپنی سابقہ قدرتی حالت کی طرف واپس جاتا ہے لہذا اس شخص کی ملکیت بھی زائل ہو جاتی ہے جو اس کو اپنی سعی و محنت کے اثرات کی بنا پر حاصل ہوئی تھی، اسی طرح ایک بنجر اور غیر باد زمین کو ایک شخص آباد کرنے کے بعد معطل چھوڑ دیتا ہے تو ایک عرصہ کے بعد اس سے آبادی کے اثرات زائل ہو جاتے ہیں اور وہ زمین اپنی سابقہ قدرتی حالت کی طرف لوٹ جاتی ہے، چنانچہ جب ایسا ہو تو اس زمین کے متعلق اس شخص کی ملکیت بھی زائل ہو جاتی ہے جو سعی و محنت کے اثرات کی وجہ سے اس کو حاصل ہوئی تھی، اور اب یہ زمین حسب سابق سب انسانوں کے استفادہ کے لئے عام ہو جاتی ہے چنانچہ اب جو دوسرا شخص پہل کر کے اس کو آباد کر لے وہ اس کا مالک بن جاتا ہے۔

الغرض مذکورہ بالا اسلامی اصول کی رو سے کسی شخص کو کسی قدرتی شے کے متعلق جو حق ملکیت حاصل ہوتا ہے وہ دائمی اور لازوال نہیں ہوتا بلکہ وقتی اور قابل زوال ہوتا ہے کیونکہ اس کی جو بنیاد ہے یعنی انسانی سعی و محنت کے اثرات، وہ عارضی اور قابل زوال ہے۔

چوتھی بات جس کا اسلامی تصور ملکیت کے سلسلہ میں جاننا ضروری ہے وہ یہ کہ مذکورہ اصول کے تحت کسی شخص کو کسی شے پر جو متعلق جو

حق ملکیت حاصل ہوتا ہے وہ ناقابل التبادل نہیں بلکہ قابل التبادل ہوتا ہے۔ یعنی مالک اگر اپنا یہ حق کسی دوسرے کی طرف منتقل کرنا چاہے تو وہ منتقل ہو جاتا ہے اور اب وہ دوسرا شخص اس شے کا مالک بن جاتا ہے، لیکن یہ اچھی طرح یاد رہے کہ اسلام کے نزدیک التبادل ملکیت کے صرف وہی طریقے جائز اور صحیح ہیں جن میں مالک کی حقیقی رضامندی موجود ہو کیونکہ قرآن و حدیث میں یہ تصریح ہے کہ کسی مسلمان کا مال اس کی رضامندی کے بغیر لینا جائز نہیں، آیت قرآنی ہے :

یا ایہا الذین آمنوا لاتاکلوا اموالکم بینکم لے ایمان والو آپس میں ایک بالباطل الا ان تكون تجارة عن تراض منکم دوسرے کا مال ناحق نہ کھاؤ مگر (سورة النساء) یہ کہ وہ تجارت کے ذریعے باہمی رضامندی سے ایک دوسرے کو ملے

اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپس میں ایک دوسرے کا مال لینا جائز نہیں سوائے اس صورت کے کہ ہر ایک فریق کی رضامندی پائی جاتی ہو، اسی طرح اس بارے میں ایک حدیث نبوی ص ہے :

لا یحل مال امرأ مسلم الا بطیب نفسہ - کسی مسلمان کا مال لینا حلال اور جائز نہیں مگر یہ کہ وہ اس کی رضا و خوشی سے ہو، اس حدیث سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ مالی لین دین کے جس طریقے میں مالک کی رضامندی نہ پائی جاتی ہو وہ ناجائز اور حرام ہے اس کے ذریعے منتقل شدہ چیز کا دوسرا مالک نہیں قرار پا تا۔

پھر چونکہ یہ واقعہ ہے کہ ایک انسان اپنی مملوکہ شے دوسرے کو رضا و خوشی کے ساتھ صرف اس وقت دیتا ہے جب اسے یہ وثوق و اطمینان ہوتا ہے کہ اس کو اس کی مملوکہ شے کا کسی نہ کسی شکل میں معاوضہ ملے گا، وہ معاوضہ زر و نقدی کی شکل میں ہو یا اجناس اور تیار سامان کی شکل میں،

خدمت و راحت کی شکل میں ہو یا عزت و شہرت کی شکل میں، اللہ کی رضا و خوشنودی کی شکل میں ہو یا اخروی اجر و ثواب کی شکل میں، بہر حال وہ کسی نہ کسی شکل میں اس شے کا معاوضہ ضرور چاہتا ہے اور یہ چاہنا اس کی فطرت کا تقاضا ہے جو کبھی بدل نہیں سکتی لہذا اسلام نے جو دین فطرت ہے انتقال ملکیت کے صرف ان ہی طریقوں کو جائز قرار دیا ہے جن میں مالک کے لئے کسی نہ کسی شکل میں اس کی مملوک شے کا معاوضہ موجود ہوتا ہے لہذا ان میں اس کی رضامندی پائی جاتی ہے۔ عام اور معمولی حالات میں وہ طریقے حسب ذیل ہیں :

اول: تجارت اور بیع و شرا کا طریقہ، جس میں ہر فریق اپنی مرضی سے اپنی چیز کا دوسروں کی چیز سے تبادلہ کرتا ہے لہذا اس میں ہر فریق کے لئے اس کی شے کا معاوضہ مادی شکل میں موجود ہوتا ہے۔

دوم: لوکری و ملازمت کا طریقہ جس میں ایک فریق دوسرے کو اپنی خدمت پیش کرتا اور دوسرا اس کے بدلے میں اس کو مادی معاوضہ ادا کرتا ہے، اس میں بھی چونکہ ہر فریق کے لئے اس کی شے کا معاوضہ موجود ہوتا ہے لہذا رضامندی پائی جاتی ہے۔

سوم: صدقہ اور ہبہ کا طریقہ، جس میں ایک شخص از راہ ہمدردی و خیرخواہی اپنی مملوکہ شے دوسرے کو دے دیتا ہے اور اسے یقین ہوتا ہے کہ اس کے بدلے میں اس کو اللہ کی رضا اور خوشنودی حاصل ہوگی اور دونوں جہاں میں اس کا بہتر اجر و ثواب ملے گا، لہذا اس طریقہ میں بھی دینے والے مالک کی رضامندی موجود ہوتی ہے، علاوہ ازیں جو شخص اپنی چیز اپنے کسی عزیز، دوست اور بزرگ کو بطور ہبہ اور ہدیہ پیش کرتا ہے اسے وثوق ہوتا ہے کہ اس سے اس کا عزیز، دوست اور بزرگ خوش ہوگا اور اس کی ذات سے اس کو فائدہ پہنچے گا اور نیز چونکہ یہ ایک لیک عمل ہے لہذا اللہ کی طرف سے اس کا اجر و ثواب بھی ضرور ملے گا بنا بریں وہ اس پیش کش میں راضی ہوتا ہے۔

چہارم : ادھار اور قرضِ حسنہ کا طریقہ، اس میں بھی ظاہر ہے کہ جو شخص اپنی چیز کسی ضرورت مند کو قرض کے طور پر دیتا ہے اس کے عوض اس کو مقررہ معاہد کے بعد ویسی ہی چیز واپس مل جاتی ہے، نیز اس ہمدردانہ نیک عمل پر وہ عند اللہ اجر و ثواب کا مستحق قرار پاتا ہے، لہذا اس طریقہ میں بھی مالک کے لئے معاوضہ موجود ہونے کی وجہ سے اس کی رضامندی پائی جاتی ہے۔

پنجم : وراثت و وصیت کا طریقہ ہے جس میں ایک شخص کے مرنے کے بعد اس کا مال اس کے رشتہ دار وارث کو اور اس کو جس کے حق میں متوفی نے وصیت کی ہو مل جاتا ہے، اس طریقہ میں بھی غور سے دیکھا جائے تو مالک کی رضامندی موجود ہوتی ہے، وصیت کی صورت میں تو ظاہر ہے کہ وہ اپنی خوشی سے وصیت کرتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ اس احسان و بھلائی کا اجر اس کو آخرت میں ضرور ملے گا کیونکہ اللہ نے اس پر اجر کا وعدہ فرمایا ہے، وراثت کی صورت میں یوں کہ ایک شخص یہ جاننے کے باوجود کہ اس کے مرنے کے بعد اس کا متروکہ مال اس کے ورثہ کو مل جائے گا پھر بھی مال جمع اور محفوظ کرتا ہے تو گویا یہ چاہتا ہے کہ اس کا متروکہ مال اس کے ورثہ کو ملے جن کے ساتھ اس کا خونی اور نسبی رشتہ ہے اور جو زندگی میں اس کے ساتھ دکھ سکھ میں شریک ہوتے ہیں اور ہمدردی و خیر خواہی کے ساتھ پیش آتے ہیں، مثلاً والدین تو جمع ہی اس لئے کرتے ہیں کہ ان کے مرنے کے بعد ان کی اولاد اس سے لائدہ اٹھائے اور چونکہ رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی اور حسن سلوک ایک ایسا نیک عمل ہے جس پر اجر و ثواب کا حتمی وعدہ ہے لہذا اس طریقہ میں بھی مالک کے لئے اس کی شے کا معاوضہ اخروی اجر و ثواب کی شکل میں موجود ہوتا ہے جو رضامندی کی ایک زائد دلیل ہے۔

معمولی اور ہر امن حالات میں انتقالِ ملکیت کے لئے مذکورہ بالاچ طریقے ہیں جن کو اسلام جائز اور درست سمجھتا ہے اور جن کے ذریعے منتقل شدہ

شے کا دوسرے کو مالک تسلیم کرتا ہے ، ان کے سوا باقی تمام طریقوں کو ناجائز اور باطل قرار دیتا ہے جن میں پہلے مالک کے لئے اس کی شے کا کسی شکل میں معاوضہ موجود نہیں ہوتا لہذا ان میں اس کی حقیقی رضا مندی بھی نہیں پائی جاتی، جیسے چوری، غصب، خیانت، جوا، سود اور رشوت وغیرہ کے طریقے کہ ان میں مالک کے لئے نہ تو اس کی شے کا کوئی معاوضہ موجود ہوتا ہے اور نہ اس کی حقیقی رضا مندی پائی جاتی ہے لہذا ان کے ذریعے منتقل شدہ شے کا ایک سارق غاصب خائن، سودخوار اور راشی شخص مالک نہیں قرار پاتا بلکہ بدستور پہلا شخص اس شے کا مالک رہتا ہے ۔

یہ ہے اسلام کا وہ اصولی تصور، جو قرآن و حدیث سے شخصی و انفرادی ملکیت کے متعلق ثابت ہوتا ہے، اس کا مختصر خلاصہ حسب ذیل ہے،

(ا) خالق اور رب ہونے کی حیثیت سے ہر شے کا حقیقی اور دائمی مالک صرف اللہ تعالیٰ ہے صرف اسی کو ہر شے میں ہر قسم کے تصرف کا ذاتی، کلی اور مطلق اختیار ہے اور اس کے کسی تصرف پر کسی کو چون و چرا کرنے کا کوئی حق نہیں، چنانچہ اس لحاظ سے کوئی انسان کسی چیز کا مالک نہیں بلکہ وہ خود بھی اللہ کا مملوک ہے ۔

(ب) اللہ تعالیٰ نے اپنی پیدا کردہ جملہ اشیا سے بنی نوع انسان کو انتفاع و استفادے کا اور ان میں ہر اس تصرف کا جو انتفاع و استفادے کے لئے ضروری ہو عمومی حق دیا ہے اور اس حق میں تمام انسان بحیثیت انسان کے برابر ہیں اور کسی کو کسی پر کوئی ترجیح نہیں، لیکن یہ مساوات اس وقت تک ہے جب تک کہ وہ اشیا اپنی قدرتی حالت و شکل پر باقی و برقرار رہتی ہیں اور کسی انسان کے قبضہ و تصرف میں نہیں آتیں ۔

(ج) جب کوئی شخص دوسروں سے سبقت کر کے کسی قدرتی شے پر قبضہ کر لیتا اور اس میں تصرف کر کے اس کی ایجادیت کو بڑھا دیتا ہے تو اس

شخص کو اس شے سے استفادے کے حق میں دوسروں پر ترجیح و تفضیل حاصل ہو جاتی ہے۔ بالفاظ دیگر وہ اس کا مالک بن جاتا ہے، ابد دوسرے کسی کے لئے یہ جایز نہیں ہوتا کہ وہ بغیر اس کی اجازت کے اس شے سے استفادہ کرے اور چونکہ اس ملکیت کی علت اور بنیاد وہ اثرات ہوتے ہیں جو اس شخص کی سعی و محنت سے اس شے کے ساتھ قائم ہو گئے ہوتے ہیں لہذا جب تک وہ اثرات قائم رہتے ہیں ملکیت قائم رہتی ہے اور جب وہ زائل ہو جاتے ہیں تو ملکیت بھی زائل ہو جاتی ہے۔

(د) چونکہ اللہ تعالیٰ کی ملکیت اور انسان کی ملکیت کے معنی الگ الگ ہیں لیکن ان کے درمیان کوئی تعارض اور ٹکراؤ واقع نہیں ہوتا اس لئے کہ اللہ تعالیٰ النفع و استفادہ کا محتاج نہیں لہذا ایک ہی شے ایک وقت اللہ کی ملکیت بھی ہو سکتی ہے اور ایک انسان کی ملکیت بھی، جب کہ ایک ہی شے ایک وقت دو انسانوں کی مستقل ملکیت نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ دونوں استفادہ کے محتاج ہیں، اور کسی شے کے متعلق ایک انسان کی ملکیت کے معنی ہیں اس شے سے استفادہ کے حق میں اس انسان کو دیگر تمام سالوں پر ترجیح حاصل ہے اور یہ ایک کو حاصل ہو تو دوسرے کو حاصل نہیں ہو سکتی، لہذا دو انسانوں کی مستقل ملکیت ایک وقت ایک شے میں جمع نہیں ہو سکتی ورنہ اس میں تعارض اور تصادم واقع ہوگا۔

(ه) اسلام میں انتقال ملکیت کے جایز طریقے پانچ ہیں : تجارتی لین دین کا طریقہ، لوکری اور ملازمت کا طریقہ، صدقے اور ہبہ کا طریقہ، ادھار اور قرض کا طریقہ، وراثت اور وصیت کا طریقہ، ان پانچ طریقوں سے ایک شے کے متعلق ایک شخص کی ملکیت دوسرے کی طرف منتقل ہو جاتی اور دوسرا اس کا مالک قرار پا جاتا ہے۔

شخصی و انفرادی ملکیت سے متعلق اسلام کا جو اصولی و کلی تصور پیش

کیا گیا ہے ظاہر ہے اس کی رو سے جس طرح کوئی شغل کسی اور شے کا مالک قرار پاتا ہے اسی طرح ایک خطہ زمین کا بھی مالک قرار پاسکتا ہے کیوں کہ جس سبب کی بنا پر ملکیت کسی دوسری چیز میں متحقق ہوتی ہے جب وہی سبب کسی خطہ زمین میں پایا جائے تو اس میں وہ کیوں متحقق نہ ہو، پھر کیف عقل و قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ جس شے میں بھی سبب ملکیت پایا جائے اس میں ملکیت کو تسلیم کیا جائے۔ (باقی)

